۷

تاریخ: غیر مغربی پس منظر میں

وینے لال

انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی ہند کی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب لکھی گئی جو اس صدی کے آخر تک نہ صرف ہندوستانی تاریخ کا مستند حوالہ تھی بلکہ برطانوی افسر شاہی کی ''آسمانی مخلوق'' کے لیے جیمز مل کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری تھا۔ جیمز مل، جو کہ جان سٹورٹ مل کا والد تھا، نے ہندوستانی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا۔ اس کے دور میں تاریخ کو قدیم، قرونِ وسطیٰ یا جدید ادوار میں تقسیم کرنا بڑی عام سی بات تھی حتیٰ کہ جدید دور کی ابتداء (Early Modern) جیسی اصطلاحات بھی استعمال نہیں کی جاتی تھیں اور ایک معصوم قاری کو ہرگز یہ نہیں لگتا کہ جیمز مل تاریخ دانی کے مروجہ نمونے سے روگردانی کر رہا ہے۔ اس نے قدیم ہندوستان کو 'ہندو' اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کو 'مسلمان' قرار دیا ہے۔

انگریزی زبان میں 'قرونِ وسطیٰ' کے ساتھ بہت سے ناخوشگوار اور ملامت انگیز مفاہیم وابستہ ہیں۔ قرونِ وسطیٰ نہ صرف تاریخ کے ایک دور کا نام ہے بلکہ یہ ایک خاص ذہنیت کو آشکارا کرتی ہے۔ یہ ذہنیت عقلیت کے فقدان، ترقی کی مخالفت، جاہلانہ افکار، عقائد اور رویوں پر مبنی تھی۔ مل نے یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے دور کو جو کہ درحقیقت 'سیاہ دور' سے ہی مطابقت رکھتا ہے، اسلام کے ساتھ ملانے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مل اس بات سے آگاہ تھا کہ دوسری صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان پوری طرح مسلمانوں کے زیرنگیں ہو چکا تھا۔ اس کا آغاز دہلی کی سلطنت پر حکمرانی سے ہوا

تھا اور ہوسکتا ہے کہ مل کو اس بات کی بھی کسی حد تک خبر ہو کہ دکن میں بھی مسلمان سلطنت تھی لیکن بہت سے نوآبادیاتی تاریخ دانوں اور ہندوستان پر تبصرہ کرنے والوں کی طرح اس نے بھی یہ بے کار کوشش کی ہے کہ شمالی ہندوستان کی تاریخ کو پورے ہندوستان کی تاریخ بنا کر پیش کیا جائے۔

جیسا کہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی بھی طالب علم پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ جن وجوہات کی بناء پر مل نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کو 'ہندو' اور بطور خاص قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کو 'محمدن' یا مسلمان دور کے طور پر تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان وجوہات سے معقول دلائل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے لیکن شیوازم، وشنوازم، شکتی ازم اور بہت سارے دوسرے مذاہب جو بعد ازاں ہندومت میں ضم ہوگئے، کی موجودگی بھی برقرار رہی۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کا مسلم ہندوستان کے ساتھ دور دراز کا بھی کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ہندوستانی معاشرے کے مختلف طبقات کے گروہوں نے اس تیزی سے اسلام قبول کیا جو کسی بھی اور سماجی طبقے نے نہیں کیا۔ اگرچہ کچھ ہم عصروں اور بعد کے تاریخ دانوں کا جھکاؤ اس خیال کی جانب تھا کہ شمالی ہندوستان مسلمانوں کی آہنی حکومت کے زیر اثر تھا، مگر بہت سارے مسلمان مذہبی علماء کو اس امر پر شک تھا کہ آیا ہندوستان کو ایسی سرزمین گردانا جا سکتا ہے جس پر شریعت کا نظام قائم ہے یا نہیں؟ مل کے تقسیم کردہ تاریخ کے مختلف ادوار ہندو مسلم امتزاج سے پیدا ہونے والے منفرد نظام کی روداد بیان نہیں کر سکتے جنہیں وہ ہندوستانی تاریخ کا سیاہ دور گردانتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے بعض آبادیاتی (اور بعض نوآبادیاتی) اسلوب، بے تحاشہ رعونت جس کا خاصہ ہے، ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرتے ہیں۔ مل اور اس کے سیکڑوں ہم عصروں کا خیال تھا کہ یورپ کا 'سیاہ دور' ہر جگہ کا ہی 'سیاہ دور' تھا۔

چنانچہ مل ان افراد میں سے تھا جنہوں نے ہندوستانی تاریخ کو فرقہ وارانہ (Communalization) بنانے میں حصہ لیا۔ اس کے تعصّبات کسی بھی طرح سے نئے نہ تھے۔ اگرچہ اس نے اسلام کے خلاف شدید بغض وعناد کا اظہار کیا تو یہ اس کے آباؤ اجداد اور پیش روؤں کی بھی عادت تھی، بلکہ وہ تو ہندومت کو برا بھلا کہنے میں اس سے بھی زیادہ شدت پسند تھا۔ اس نے ہندومت کو ایک جنگلی مذہب کہا جس

میں بندر اور بندر یا خدا ہوتے ہیں، جنہیں انسانی کھوپڑیوں کے ہار پہنا کر سجایا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ مل پر تنقید کرنے کی بہت سی معقول وجوہات ہیں لیکن اس کی تحریروں کو بہر طور شک کی نگاہ سے دیکھنے کی ایک اور خاص وجہ بھی ہے۔ ایک عام قاری اس بات کی عین توقع رکھ سکتا ہے کہ اگر مل نے قدیم ہندوستان کو ہندو اور قرونِ وسطیٰ کو مسلمان کہا ہے تو جدید ہندوستان کو وہ لازماً عیسائی کہے گا۔ ۱۸۱۸ء میں جب مل کی تحریر کردہ تاریخ کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، اس وقت ہندوستان کے بہت سے حصے برطانوی حکومت کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کے مطابق ہندوستان میں مشنری سرگرمیوں پر پابندی تھی لیکن اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان پر حکومت کرنے والے انگریز خود کو عیسائی طاقت کا نمائندہ سمجھتے تھے۔

جب ۱۷۹۷ء میں چارلس گرانٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹرز کو ''برطانوی راج کے ایشیائی عوام کے معاشروں کی حالت زار کا مشاہدہ'' کے نام سے اپنا مقالہ پیش کیا تو یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ عیسائیوں نے برطانوی ہندوستان کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ہموار میدان بنانے کی جنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گرانٹ نے اپنے اس یقین کا اعلان کرنے میں بہت صاف گوئی سے کام لیا کہ عیسائیت کو مستقل طور پر ان کے سامنے پیش کرنے کی نسبت ان کے توہمات کا خاتمہ اور ہندوؤں کے قابل نفرت رسوم و رواج سے ان کا لگاؤ ختم کرنا زیادہ اہم ہے۔ گرانٹ نے لکھا کہ اس بات پر یقین کرنا کہ ہندوؤں کی اپنے عقائد سے ''ہٹ دھرم قسم کی عقیدت'' انہیں اپنا مذہب عیسائیت سے تبدیل کرنے میں مانع ہوگی، ا یورپیوں کے ماضی کے تجربات سے بھی عیاں ہے۔

اگر برطانیہ، ایک عیسائی طاقت تھا اور ہندوستان کے انگریز خود کو عیسائیت کی روایات کا امین سمجھتے تھے، تو مل کو چاہیے تھا کہ وہ پوری دیانتداری سے ہندوستان کے جدید دور کو 'عیسائی' سمجھے بالکل اسی طرح جیسے اس نے قدیم ہندوستان کو 'ہندو' اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کو 'مسلمان' سمجھا ہے۔ مگر اس نے ہندوستان کی تاریخ کے نئے دور کے لیے 'برطانوی' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہاں انتہائی عیاری سے کام لیا گیا ہے جو عیسائیت زدہ مغرب میں طاقت کے استعمال کے متعلق آج تک

ایک شہادت ہے۔ اپنے بے شمار اہلِ علم ہم عصروں کی مانند مل کے لیے بھی پروٹسٹنٹ عیسائی (عیسائیوں کا ایک فرقہ) ہی ایک معقول اور عقلی عقیدہ کے حامل ہیں۔ اس بات کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے تمام مذاہب حتیٰ کہ کیتھولک عیسائی (عیسائیوں کا ایک اور فرقہ) بھی پروٹسٹنٹ فرقے کے خلاف سمجھے جاتے ہیں اور انہیں انتہائی حد تک غیر معقول سمجھا جاتا ہے لیکن ایک بہانہ جس سے مل کو شہہ ملتی ہے اور اسے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا موقع ملتا ہے، وہ ہے جہاں جدید برطانیہ، مذاہب کی حدود سے ماوراء دکھائی دیتا ہے۔

مل بہت سے مفروضوں سے کام لیتا رہا جس میں پہلا یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے کے آئین میں مذہب سب سے زیادہ غالب اور پیچیدہ پہلو ہے۔ ہندوستان کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے، مذہب اور اس کی بنیاد پر جنگیں ہی وہ چیز ہیں جنہوں نے اس کی تاریخ ترتیب دی ہے۔ دوسرا یہ کہ یورپ کی روشن خیالی اس چیز میں کامیاب ہوگئی تھی کہ وہ چرچ اور ریاست کے درمیان تقسیم قائم کردے اور جدید خیال بننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ پہلے لادینیت (سیکولرازم) کو قبول کرے۔ تیسرے، اس بات سے بخوبی آگاہ ہونے کے باوجود کہ انجیلی فرقے کے عیسائیوں نے عوام میں اچھی خاصی جگہ بنالی تھی، مل نے جان بوجھ کر ایسی حقیقی حالت کی وکالت کی جس نے مذہب کو 'نادیدہ ہاتھ' میں بدل دیا اصولی طور پر، اس امر پر بحث کرنا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے اور اسے عوامی زندگی سے الگ کردینا چاہیے، بالکل درست اور اچھی بات تھی لیکن اخلاقی اصولوں سے عاری سیاست کی ہٹ دھرمی کا تقاضا تھا کہ مذہب کو بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل رہے۔

اس ایک مثال سے مجھے بہت سے بنیادی اصولوں کو قائم کرنے میں مدد ملی ہے۔ پہلا یہ کہ یورپ کی تاریخ تمام دوسری تاریخوں کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم اس حقیقت سے بہت کم باخبر ہوتے ہیں اور یورپی مرکزیت پر مبنی تاریخ کے علی الرغم کوئی تاریخ لکھ رہے ہوتے ہیں۔ جو بات ہندوستانی تاریخ کے لیے درست ہے وہ قریب قریب ہر قومی تاریخ کے لیے بھی درست ہے۔ اس کو مختلف خانوں میں تقسیم کردینا یعنی قدیم، ازمنۂ وسطیٰ اور جدید،

اس رویے کی محض ایک مثال ہے۔اس تقسیم نے یورپی تاریخ کے مطالعے میں رہنمائی کی ہے،اس تقسیم کو'فطری' خیال کیا جاتا ہے،جس کے ذریعے کسی بھی تاریخ کی تعبیر کی جاسکتی ہے۔

دوسرا اصول یہ کہ معاصر تاریخ میں،سہواً یا عمداً،دنیاوی اور مذہبی خط کھینچنا رہنما اصول رہا ہے۔ جیسے جیسے ہم قدیم دور سے جدید دور کی طرف آتے ہیں،تو یہ مفروضہ بھی قائم کرلیا جاتا ہے کہ ہم غلامی سے آزادی،مذہبیت سے لادینیت اور معاشرتی روایات میں جکڑی زندگی سے انفرادیت کی طرف آتے ہیں۔اس بیانیے میں،بدترین عصری کشمکش فوراً ہی ازمنہ وسطیٰ کی باقیات بن جاتی ہے۔چنانچہ سرب قوم پرستوں کا جنون (Fanaticism)،ہندو بنیاد پرستی اور مسلمان دہشت گردی ایک ایسی چیز ہے جو کہ مظالم کا مرتکب شخص جدید آزادی کی جانب اپنی مشکلات اور رکاوٹوں سے بھرپور سفر میں انہیں پیچھے چھوڑنے میں ناکام رہا ہے۔

تیسرا یہ کہ تاریخ کا یہ فہم غیر یورپی لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی اور تاریخ کے سہارے زندہ رہیں۔جس کا اثر زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔یورپ کا ماضی انڈیا اور افریقہ میں رہنے والے لوگوں کا حال ہے۔جب آخر کار مقامی باشندے منزل پر پہنچتے ہیں تو وہاں انہیں صرف اس بات کی خبر ملتی ہے کہ یورپی افراد کسی اور منزل کی جانب روانہ ہوچکے ہیں اور اسٹیشن پر صرف ان کا سامان باقی ہے جسے مقامی لوگ اکٹھا کریں گے۔

چوتھا یہ کہ،اوپر بیان کیے گئے نکات کی روشنی میں اس بات کو سمجھنا ناگزیر ہوجاتا ہے کہ ساری تاریخ درحقیقت یورپی تاریخ ہی ہے۔لاطینی امریکہ،افریقہ اور انڈیا کی تاریخ نہ صرف تاریخ کے مرکزی دھارے کو مدد بہم پہنچاتی ہے،بلکہ یہ یورپی تاریخ کے جسم میں اعضاء کی حیثیت رکھتی ہے۔وہ یورپی تہذیب،خیالات اور عقلیت کے مختلف شعبوں کی وضاحت کرتی ہے جو خود یورپ کے لیے بھی نادیدہ ہیں اور اگر نظر آتے بھی ہیں تو ایک خاص حد تک۔

پانچواں،یورپ زدگی کا مسئلہ نہ صرف غیر یورپی تہذیبوں کے مطالعے پر برا اثر ڈالتا ہے،بلکہ یورپ کی تاریخ اور پورے مغرب کی تاریخ کے خاکے کو سمجھنے میں بھی مشکل پیدا کرتا ہے۔یہ ایک مسلمہ

حقیقت ہے کہ برطانیہ کی بہت سی برطانوی تاریخیں نوآبادیاتی نظام کی تاریخ سے صرف نظر کرتی ہیں۔ یقیناً یہ تو طے شدہ بات ہے برطانیہ ایک سامراج تھا، لیکن برطانوی تاریخ دان اس تاثر کو پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ سمندر پار برطانیہ کی تاریخ، برطانوی تاریخ، تہذیب اور سیاست پر بہت ہی کم اثرات رکھتی ہے۔

ایک اور مثال لیجیے: امریکی غیر معمولیت، اس کا جو بھی پہلو ہو، یہ صرف انہی لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے جو امریکی تاریخ اور اس کی قسمت کی نوعیت کا معمہ حل کرنا چاہتے ہیں یہ دنیا کے تقریباً ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ ایک مرتبہ میں نے عوامی طور پر یہ تجویز دی تھی کہ امریکہ کے صدارتی انتخاب میں دنیا کے ہر بالغ شخص کو ووٹ ڈالنے کا حق ملنا چاہیے۔ کیونکہ تقریباً ساری ہی دنیا اور خاص طور پر چھوٹی، غیر محفوظ اور (امریکیوں ہی کی زبان میں ان کے کیمپ کی پیروی کرنے والی) 'بدمعاش' (Rogue) قوموں کی قسمت بہت حد تک اس بات پر انحصار کرتی ہے کہ دنیا کے سب سے طاقتور عہدے پر کون شخص فائز ہوگا۔ امریکہ کی جنگی مشینری سے متاثر ہونے والی قوموں کو اپنی تباہی کا ایجنٹ منتخب کرنے کی اجازت تو یقیناً دینی ہی چاہیے! بالکل اسی طرح ہمیں اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ قومی تاریخوں کو، اگر قومی تاریخ لکھنے کی کوشش کر ہی لی جائے، ان اقوام کے شہریوں کے ہاتھوں میں نہ چھوڑ دیا جائے جن کی تاریخ لکھنا پیشِ نظر ہو! قومی تاریخ کے معاملے میں تقریباً ہر شخص ہی قوم پرست ہے۔

یورپی بھیڑیا، ایک بھیڑ کے روپ میں:
دنیا کی تاریخ کا نیا اضطراب

'یورپ زدہ' تاریخ کے خطرے اور ایسے ہی دوسرے مسائل سے چھٹکارے کی ہماری کوششوں کو حیرت انگیز طور پر تاریخ دانی میں جدید ترین اضطراب کی مکمل روداد کے ذریعے مواد فراہم کیا جا رہا ہے۔ جسے خاص طور پر امریکہ میں 'عالمی تاریخ میں احیائے علوم' کہا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط سے عالمی تاریخ کی کانفرنسوں کے سلسلے میں تیزی سے بڑھوتری مشاہدے میں آئی ہے۔ اس میدان

میں نئی ملازمتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور درج ذیل کتب نے، جو عالمی تاریخ کے موضوع پر ہیں، بے تحاشہ تحسین اور غیر معمولی طور پر قارئین کی بڑی تعداد کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہ کتب اور ان کے مصنفین مندرجہ ذیل ہیں:

1- Guns, Germs and Steel: The Fates of Human Societies (1997) - Jared Diamond

2- The Wealth and Poverty of Nations: Why some are so rich and some so poor (1998) - David Landes

3- Empire: The Rise and Demise of the British World Order and the Lessons for Global Power (2004) - Niall Ferguson

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا نے اب سے تقریباً دس برس قبل عالمی تاریخ کے مطالعے کے لیے متعدد نئے کیمپس قائم کرنے کا آغاز کیا اور اس کی اولین پیش کش (مطبوعات) میں سے The California World History Library نامی کتب کا ایک سلسلہ ہے جسے یونیورسٹی نے خود ہی چھاپا ہے۔ اس سلسلے کی دوسری جلد Maps of Time (2004) کو عظیم تاریخ کے ضمن میں ایک اہم کام قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف ڈیوڈ کرسچین اپنے اس کارنامے کو اپنے اس احساس کا نتیجہ قرار دیتا ہے کہ حقیقت کو ٹوٹی پھوٹی کہانیوں میں بیان کرنے سے علمیت کا زور باقی نہیں رہتا۔ تاریخ کو اس طرح سے بیان کرنا پچھلی دو دہائیوں سے عام رواج بن گیا ہے اور یہ کہ تاریخ دانوں کو سائنس دانوں سے سبق سیکھنا چاہیے (ص ۳)۔ اگر سائنسدان کو ''عظیم اکائی کا نظریہ'' نامعقول اور بے کار نہیں لگتا تو تاریخ دان کو ایک ہی عظیم بیانیہ اختیار کرنے سے کیوں انکار ہے؟ ڈیوڈ کرسچین یہ دلیل دیتا ہے کہ 'عظیم کہانیوں' کو بیان کرنے سے 'مقصدیت' پیدا کی جا سکتی ہے اور جو اہلِ علم 'عظیم بیانیہ' کو بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں انہیں اس بات کا خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں وہ غیر اہم نہ ہو جائیں (ص ۹، ۱۰)۔ وہ اہم ترین جواب الجواب پر غور نہیں کرتا کہ سماجی سائنس میں اہم ترین مسئلہ سائنسدانوں کی پیروی کرنا ہی رہا ہے۔ نہ تو اس نے خود انعکاسی کا کوئی درجہ ظاہر کیا اور نہ ہی اس نے یہ

سوچنے کی زحمت کی کہ بڑا سوچنا امریکیوں کی کتنی عام عادت ہے۔ اور یہ اس لیے کہ اُسے کہیں غیر اہم نہ سمجھ لیا جائے۔

کیلیفورنیا ایک ''بڑی'' قومی ریاست میں ایک ''بڑی'' ریاست ہے۔ اور یہ اس کے بالکل مخالف بات ہے کہ 'عظیم تاریخ' کی بنیاد وہ جگہ ہو جو زیادہ تر خود کو دنیا کا مرکز سمجھتی ہو۔ لاس اینجلس، جو کیلیفورنیا کا ایک بہت بڑا دارالحکومت ہے، کے متعلق بے شمار کہاوتیں ہیں جو اس کے متعلق بارہا کہی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے اسکولوں میں سو سے زیادہ زبانیں سنی جاسکتی ہیں۔ لیکن جس بات کا ذکر اس کے ساتھ نہیں کیا جاتا وہ یہ ہے کہ انگریزی، ہسپانوی، ویت نامی، ہندی، گجراتی، کوریائی، جاپانی اور سواحلی وغیرہ زبانے بولنے والے سب کے سب Wal-Mart سے خریداری کرتے ہیں اور میکڈونلڈز کے برگر کھاتے ہیں۔ متنوع ثقافتوں پر مبنی نظام کی زبردست بھوک ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر کے بعد سے امریکہ کا یہ طریقہ کار ہے کہ وہ دنیا کو کھائے جا رہا ہے۔

لیکن ہم اسکولوں کی طرف واپس آتے ہیں: اگر دنیا لاس اینجلس آ گئی ہے تو وہ دنیا کی کیوں پروا کرے؟ کیلیفورنیا کی ریاست دنیا کی بہت زیادہ پروا نہیں کرتی۔ اس بات کا مشاہدہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ہی زلزلوں یا وہاں مختلف جگہوں پر لگنے والی آگ، مٹی کے تودے پھسلنے اور بڑی بڑی سڑکوں کے معاملات وغیرہ ہی میں الجھی رہتی ہے۔ بلاشبہ ایک شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ تمام مشکلات جو کیلیفورنیا کے باشندوں کو پیش آتی رہتی ہیں، یہ بائبل کے دعوے کے مطابق، خدا کی اپنی زمین میں زندگی کے پیمانے پر خوش آئند ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم یہ بھول ہی جائیں کہ کیلیفورنیا کی ریاست کس قدر بڑی ہے، اس لیے یہ ذکر کر دینا مفید ہوگا کہ اس کی معیشت کو دنیا کی ساتویں یا آٹھویں بڑی معیشت کہا جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ طاقت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے خریداری کو معیشت کے حجم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن ایک شخص بآسانی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ کیلیفورنیا کی ریاست اپنے متعلق بڑے مغرور انداز میں سوچتی ہے جو ایک طرف تو دنیا کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور دوسری طرف یہ ایک بڑی 'سنہری ریاست' ہے جو دنیا پر اپنی کرنیں بکھیرتی رہتی ہے۔

اس طرح سے عظیم تاریخ اور عالمی تاریخ کی لاتعداد طریقوں سے اپنی اپنی سیاسی معیشت ہے۔ عظیم جگہوں پر ایک شخص کے ارادوں کو بھی عظیم ہونا چاہیے اور کوئی یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا کہ عالمی تاریخ خرطوم، طرابلس، ڈھاکہ، کوالالمپور یا لیما سے وارد ہوگی۔ اسپینگلر سے اب تک، عالمی تاریخ ایک ایسا مکالمہ ہے جس میں نوآبادیاتی عوام اور اب غیر ترقی یافتہ ممالک کے عوام کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ بہت زیادہ باخبر حلقوں میں جہاں اعلیٰ علم و دانش پر مبنی مکالمے ہوتے ہیں، اس گفتگو کا موضوع یہ عوام ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہندوستانیوں نے اپنی تاریخ کا کنٹرول سنبھال لیا ہو جیسا کہ (اگرچہ کسی کم حد تک) افریقیوں نے افریقہ کی تاریخ سنبھال لی ہے، لیکن ''عالمی تاریخ'' جسے عالمگیر عیسائیت کے اتحاد کا ذہن رکھنے والوں کا میدان بنا کر پیش کیا جاتا ہے، وہ مغربی اہل علم ہی کا میدان اور ان کی اصل ہے۔ کسی بھی قسم کی جدید علمیت کے لوازم تو بہت سے ہیں لیکن اس سے بھی وسیع تر، متن کی ترتیب ہے جو مختلف زبانوں میں ہے اور عالمی تاریخ دانوں کو ان تمام زبانوں کی ضرورت پڑے گی اور یہ مغربی درسگاہوں سے باہر (کہ ایک شخص کئی زبانیں جانتا ہو) شاذ و نادر ہی ملے گا۔ اس کے علاوہ جن دارالحکومتوں کا میں نے ذکر کیا ہے وہاں کے تاریخ دان لازماً انہیں دستیاب تاریخوں کو نوآبادیاتی اثرات سے پاک کرنے کے عمل (de-colonization) میں ہی مصروف ملیں گے۔

اگرچہ دی پیش چکرابارتی نے دلیل دی ہے کہ یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ تاریخ کا موضوع ہمیشہ سے یورپ رہا ہو، حتیٰ کہ جب ان تاریخوں کے متعلق بھی بات ہو رہی ہو جو کہ واضح انداز میں لاطینی امریکہ، افریقہ یا انڈیا کے متعلق ہوں۔[۲]

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالمی تاریخ نے یورپ کی طرف تاریخ کے منبع کے طور پر رخ نہیں کیا بلکہ یہ رجوع بہت زیادہ انتشار کی صورت میں جو کہ عظیم بیانیہ (Grand Narratives) میں عقیدے کے ختم ہونے کے متعلق ہے، وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور انتشار کی دوسری وجہ فرانس کی ذہنی بیماریوں کے وہ مذموم اثرات ہیں جنہیں مابعد ساختیات (Post Structuralism) اور لیکونیائی تحلیل نفسی (Laconian Psychoanalysis) کا نام دیا جاتا ہے۔ سائنس کی تاریخ کے عدم تحرک اور توضیحی

دائرہ کار کے نفوذ کی وجہ سے جو کہ مستقل بنیادوں پر علم اور طاقت کے سلسلے کی چھان بین کرتے ہیں، عالمی تاریخ کا رخ یورپ کی جانب ہوا ہے لیکن غالباً اس نے تاریخ کو اس کے 'درست' گھر تک پہنچا دیا ہے۔

[دیپے لال یونیورسٹی آف دہلی اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا لاس اینجلس (UCLA) میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔]

(ترجمہ: منزہ صدیقی)

Source: Third World Resurgence No. 266/267, October/November 2012, pp 39-41

حواشی.....

1. Charles Grant, *Observations on the State of Society among the Asiatic Subjects of Great Britain, particularly with respect to Morals . . . Written chiefly in the year 1792* (Ordered, to be Printed, by the House of Commons, 1813), p. 88.

2. Dipesh Chakrabarty, *Provincializing Europe: Postcolonial Thought and Historical Difference* (Princeton: Princeton University Press, 2000), pp. 27-46.